© rasailojaraid.com

قسط نمبر ۱

تعلیم و تعلّم

ڈاکٹر سعید حسن

مسلمانوں کی تعلیمی نشو و نما کی یہ خصوصیت شاید دوسری قوموں میں بہت کم پائی جائے گی کہ اول اول سیکڑوں سال تک علم کی ترقی و اشاعت میں حکومت بالکل بے تعلق رہی، یعنی نہ انتظام تعلیم اس نے اپنے ہاتھ میں لیا اور نہ باقاعدہ تقسیم اسناد کا طریقہ رائج کیا۔

مسلمانوں کو تحصیل علم کی طرف جس چیز نے متوجہ کیا وہ صرف قرآنی ہدایات تھیں یا ارشادات نبوی، لیکن وہ خود اپنی جگہ اس قدر زوردار تھیں کہ انہوں نے نہ صرف اخلاقی قانون کی حیثیت اختیار کر لی بلکہ تحصیل علم کو مذہبی ضرورت کی حد تک پہنچا دیا، چنانچہ اس باب میں چند ہدایات ملاحظہ ہوں:

"عالم و جاہل برابر نہیں ہیں۔"، "جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے اُن کے خاص رتبے ہیں۔"، "عالم ہی خدا سے ڈرتا ہے۔"، "علم حاصل کرو اگرچہ علم چین ہی میں کیوں نہ ہو۔"، "علماء انبیاء کے وارث ہیں۔" جو "تحصیل علم کے لیے سفر کرتا ہے وہ تا واپسی خدا کی راہ میں سفر کرتا ہے۔"، "خدا اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے جو تحصیل علم کی راہ میں سفر کرتا ہے۔"

رسول اللہ کو ترویج علم کی جتنی فکر تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ بدر کے جو قیدی فدیہ نہ دے سکتے تھے ان کی رہائی کی شرط آپ نے صرف یہ قرار دی کہ وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، چونکہ رسول اللہ اپنی زندگی ہی میں اپنے اقوال و ہدایات سے تعلیم کو یک گونہ مذہبی حیثیت دے چکے تھے اس لیے آپ کے بعد بھی یہ تحریک برابر قائم رہی اور رفتہ رفتہ عرب اور دوسرے اسلامی ممالک میں علم کا اتنا چرچا ہو گیا کہ مسجدیں صرف مسجدیں نہ رہیں بلکہ درسگاہیں بھی ہو گئیں۔

استعمال مسجد

آج کل غلطی سے بعض مسلمانوں نے یہ خیال قائم کر لیا ہے کہ مسجدوں میں ذکر الٰہی کے سوا، اور کچھ نہ ہونا چاہیے لیکن تاریخ اسلامی بتاتی ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان مسجدوں کو صرف عبادت گاہ ہی نہیں خیال کرتے تھے بلکہ اسے ہر اچھے کام کے لیے موزوں سمجھتے تھے چنانچہ غریب الوطن مسافر بھی مسجد ہی میں پناہ لیتے تھے، دوسرے مقامات کے وفود بھی مسجد میں ہی آ کر ٹھہرتے تھے بلکہ بعض اوقات انتظامی و مالی معاملات بھی یہیں طے پاتے تھے۔ چنانچہ ناصر خسرو (۴۳۹ھ۔ ۱۰۴۷ء) لکھتا ہے کہ "مسجد عمر میں ہزاروں آدمی (قراء، استاد، کاتب، معاہدہ نویس اور مسافر) روز آتے جاتے تھے۔"

مجالس شوریٰ اور مجالس عدالت کے لیے بھی عموماً مسجدیں ہی استعمال کی جاتی تھیں۔ چنانچہ عمرو ابن العاص کے مقرر کیے ہوئے قاضی قیس نے (۲۴ھ۔ ۶۴۴ء) میں مسجد عمر میں مقدمات فیصل کیے ہیں۔ اسی طرح قاضی بصیر ابن نعمان بھی (۱۲۷ھ۔ ۱۲۰ھ۔ ۷۴۴ء۔ ۷۳۷ء) مساجد ہی میں مقدمات فیصلے کیا کرتے تھے اور دوسرے متعدد فقہا کے متعلق بھی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بغداد کا جامع منصور ان کی عدالت گاہ تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبادت کے بعد چونکہ سب سے زیادہ مقدس کام تعلیم خیال کیا جاتا تھا اس لیے مسجدوں کے دروازے تعلیم و تعلم کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے یہاں تک کہ خود رسول اللہ نے عقائد کی تعلیم مسجد ہی میں دی ہے اور آپ کی وفات کے بعد لوگ صحابہ کرام سے عقائد کے متعلق مساجد ہی میں سوال کرتے تھے اور صحابہ کرام مسجدوں ہی میں ان سوالات کا جواب دیتے تھے، عہد خلافت کے بعد اس سلسلہ نے زیادہ وسیع و منظم صورت اختیار کرلی یعنی طلبہ حلقے باندھ باندھ کر درس میں شریک ہونے لگے اور حدیث وفقہ کے علاوہ دوسرے علوم وفنون کے اساتذہ نے بھی لکچر دینا شروع کیے جن کا ذکر تاریخ میں بہت تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔ چنانچہ سعید ابن میسّب (متوفی ۹۵ھ ۔ ۷۱۳ء) مسجد مدنیہ میں اور حماد ابن سلمٰی (متوفی ۱۴۷ھ ۔ ۷۶۴ء) حسن بصری اور صاحب مقامات حریری، بصرہ کی مسجد میں عربی ادبیات، لسانیات اور شاعری پر درس دیا کرتے تھے۔ مقدسی، سوس میں خود ایسے حلقوں میں شریک ہوا ہے اور اس کے علاوہ اس نے فلسطین، شام، مصر وفارس کی بہت سی ایسی مسجدوں کا تذکرہ کیا ہے جہاں قاری، محدث اور ادیب جمع ہو کر علمی بحثیں جاری رکھتے تھے۔

امام شافعی فسطاط کی مسجد میں جو عمرو ابن العاص کے نام سے مشہور ہے اپنے انتقال (۸۴۰ء) سے پہلے عرصہ تک روزانہ مختلف مضامین پر درس دیا کرتے تھے، ان کا دستور تھا کہ نماز فجر کے بعد قرآن کا درس دیتے تھے۔ سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد حدیث کا درس لینے کے لیے دوسرا حلقہ آتا تھا، ظہر کی نماز کے بعد مذاکرہ ومباحثہ پر درس دیتے تھے، اس کے بعد عروض، نحو اور فن شعر کا درس دیا کرتے تھے۔ ۳۰۰ھ (۹۱۲ء) میں الکسائی کا بھی اسی طرح مساجد میں درس دینا تاریخ سے ثابت ہے۔

منقولی علوم کے علاوہ معقولات پر بھی درس دیا جاتا تھا، چنانچہ ابو بشر متی بغداد میں ارسطو کی کتاب "المنطق" پر لکچر دیا کرتے تھے اور اس میں کئی سو طلبہ شریک ہوتے تھے۔ ابن حوقل نے بھی بجستان کے بعض حلقوں کا ذکر کیا ہے جن میں مذہبی تعلیم کے علاوہ لسانیات اور شاعری کی تعلیم ہوتی تھی۔

بعض مسجدیں اپنے اساتذہ کے فضل و کمال کی وجہ سے بہت زیادہ قابل وقعت درس گاہیں خیال کی جاتی تھیں، ان میں ایک مسجد دمشق تھی جو ابن ہشام مخزومی کے علمی مباحث کی وجہ سے خاص شہرت رکھتی تھی۔ اسی طرح کوفہ کی مسجد سلمٰی درس قرآنی کی وجہ سے بہت مشہور ہوگئی۔ بغداد میں بہترین تعلیمی مرکز جامع منصور خیال کیا جاتا تھا اور اس مسجد میں تعلیم دینا اساتذہ اپنا فخر سمجھتے تھے۔ خطیب البغدادی کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ حج کرنے گئے تو انہوں نے آب زمزم کے تین گھونٹ پیے اور ہر گھونٹ پر ایک دعا مانگی۔ پہلی یہ تھی کہ وہ بغداد کی تاریخ لکھیں، دوسری یہ کہ جامع منصور میں درس دیں اور تیسری یہ کہ بصرالحفی کے قریب دفن ہوں۔ اساتذہ جس انہماک واستقلال کے ساتھ درس دیتے تھے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مشہور فقیہہ نفطویہ نے ایک ہی ستون کے نیچے بیٹھ کر دسویں صدی عیسوی میں پچاس برس تک تعلیم دی۔

بعض مساجد میں تعلیم کے لیے علیحدہ جگہیں مقرر تھیں اور یہیں اساتذہ رہتے تھے۔ یہ جگہیں "دار القراء" کے نام سے موسوم تھیں۔ مسجدوں کے علاوہ خانقاہوں اور خوشحال گھرانوں میں بھی اساتذہ رہتے تھے جو تعلیم کے باب میں غلام و آزاد اور غریب وامیر سب کو یکساں سمجھتے تھے۔

نصاب تعلیم

ابتدائی بچوں کے لیے تعلیم کے مختلف طریقے تھے لیکن اصولی طور پر ہر ملک میں یہ تعلیم قرآن مجید سے شروع ہوتی تھی تاکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عقائد مذہب ابتدا ہی سے ان میں راسخ ہو جائیں۔ بعض ممالک میں قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اہل مغرب بچوں کو پہلے صرف قرآن پاک اور کتابت کی تعلیم دیتے تھے۔ مغرب کے تمام بڑے بڑے قصبات اور قریوں میں یہی طریقہ رائج تھا حتی کہ بربری بستیوں میں بھی اسی اصول کی پابندی کی جاتی تھی اور اسی لیے اہل مغرب میں حافظ قرآن زیادہ پائے جاتے تھے۔

اہل اندلس میں تعلیم قرآن کے ساتھ دوسرے علوم کی تعلیم کا بھی رواج تھا لیکن زیادہ توجہ قرآنی تعلیم ہی پر کی جاتی تھی۔ ادبیات میں طلبہ کو فن شعر کے اصول و قوانین زبانی یاد کرائے جاتے تھے اور اس کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا کہ متعلم سن بلوغ کو پہونچنے تک اس فن سے بخوبی واقف ہو جائے۔ اس کے بعد میلان طبع کو دیکھ کر دوسرے علوم کی طرف متوجہ کیا جاتا تھا۔ اہل افریقہ بچوں کو قرآن و حدیث دونوں کی تعلیم ساتھ ساتھ دیتے تھے اور بعض اوقات دیگر علوم بھی مختصراً ابتدائی تعلیم میں شامل کر دیتے تھے لیکن تعلیم قرآن کی طرف خاص توجہ کی جاتی تھی جس میں قرأتوں اور روایتوں کو بھی پیش نظر رکھا جاتا تھا اسی کے ساتھ کتابت کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ اہل افریقہ کا طریقہ اہل اندلس سے ملتا جلتا تھا، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اندلس کے اکثر علماء ہجرت کر کے ٹیونس چلے آئے تھے۔

اہل مشرق بھی بچوں کو قرآن کے ساتھ دیگر علوم کی تعلیم دیتے تھے۔ جن میں صرف و نحو، حدیث، حساب اور اخلاقی شاعری وغیرہ شامل تھیں ان کے یہاں کتابت علیحدہ صنعت تصور کی جاتی تھی اور اس کی تعلیم کے لیے ماہر خوشنویس مقرر کیے جاتے تھے۔

قاضی ابو بکر ابن العربی نے اپنی کتاب ''الرحلۃ'' میں طریق تعلیم کے متعلق اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بچوں کو شروع میں قرآن مجید نہ پڑھانا چاہیے کیونکہ بچے اتنے سمجھدار نہیں ہوتے کہ کلام اللہ کو سمجھ سکیں اس لیے پہلے شعر و ادب کی تعلیم ہونا چاہیے اس کے بعد حساب کی۔ اس کے بعد کلام مجید کی تعلیم شروع ہونا چاہیے اور پھر حدیث فقہ و جدل اور اس کے متعلقات کی۔

ابن خلدون، ابن العربی کی رائے سے اصولاً اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابن العربی کا بتایا ہوا اصول تعلیم بہت اچھا ہے بشرطیکہ عملی طور پر حالات اس کے مساعد ہوں ورنہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اگر قرآن کی تعلیم ابتدا میں نہیں دی جاتی ہے تو پھر بچے بڑے ہو کر اس سے محروم رہ جاتے ہیں کیونکہ نوعمری میں تو والدین بچوں سے جو چاہیں کرا سکتے ہیں لیکن بالغ ہونے کے بعد ان پر قابو نہیں رہتا، ہاں اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو اس میں شک نہیں کہ ابن العربی کا بتایا ہوا طریقہ بہت مناسب ہے۔

امام غزالی نے ''احیاء العلوم'' میں تعلیم کے متعلق ایک مدلل وطویل بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انسان پر دو فرض عائد ہوتے ہیں: ایک فرض عین، دوسرا فرض کفایہ، فرض عین میں توحید، روزہ، نماز، حج وغیرہ شامل ہیں اور فرض کفایہ میں دینی و دنیوی تعلیم، علوم دینی میں وہ تفسیر، حدیث و فقہ کو رکھتے ہیں اور علوم دنیوی میں طب، حساب اور صنعتی علوم مثلاً کاشتکاری، پارچہ بافی، خیاطی وغیرہ کو شامل کرتے ہیں۔

ابن العربی اس کے بھی خلاف ہیں کہ دو علم ایک ساتھ پڑھائے جائیں۔ کیونکہ ایسے غیر معمولی ذہین طلبہ کم ہوتے ہیں جو دو علوم کو ایک ساتھ پوری طرح حاصل کر سکیں۔ ابن خلدون بھی اس باب میں ابن العربی کی تائید کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ تعلیم تھوڑی اور تدریجی ہونی چاہیے۔ پہلے ایک فن کے تمام مسائل کو طلبہ کی استعداد کے مطابق مختصر تشریح کے ساتھ ذہن نشین کرنا چاہیے اور جب ان مسائل کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہو جائے تو پھر اسی فن کی دقیق و تفصیلی تعلیم دی جائے۔ ابن خلدون اس کو بہت بڑی غلطی خیال کرتے ہیں کہ مبتدی کے سامنے ایسے مسائل پیش کیے جائیں جن کو سمجھنے سے وہ قاصر رہتا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم گھبرا کر تعلیم چھوڑ بیٹھتا ہے یا اس قدر بد شوق ہو جاتا ہے کہ علم کی تکمیل اس کے لیے ناممکن ہو جاتی ہے۔

زرنوجی اپنے رسالہ ''تعلیم المتعلم وطریقۃ التعلیم'' میں لکھتا ہے کہ امام ابو حنیفہ و دیگر مشائخ کا قول ہے کہ مبتدی کو صرف اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قدر سبق دینا چاہیے کہ دوبار دہرانے میں یاد ہو جائے اس کے بعد ہر روز سبق میں کچھ اضافہ کیا جائے لیکن تدریج کے ساتھ، کیونکہ اگر شروع میں سبق زیادہ وزنی ہوگا تو بار بار دہرانے کی ضرورت پیش آئے گی اور طالب علم کو کئی مرتبہ پڑھ کر سمجھنے کی عادت ہو جائے گی اور یہ عادت بڑی مشکل سے چھوٹتی ہے۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ مبتدی کی سمجھ میں آجائے۔ شیخ الاسلام استاد اشرف الدین عقیلی کا قول ہے کہ تعلیم کے معاملہ میں وہی طریقہ بہتر ہے جو پہلے مشائخ اختیار کرتے تھے۔ مبتدی کو پہلے "صفارات المبسوط" شروع کرانا چاہیے جو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے اور یاد بھی ہو جاتی ہے۔ متعلم کوئی ایسی چیز نہ لکھے نہ پڑھے جس کو خود نہ سمجھتا ہو کیونکہ ایسا کرنے سے طبیعت میں سستی اور سمجھ میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔

ابن خلدون کے نزدیک سبق میں تکرار و ارتباط کی رعایت ضروری ہے بغیر اس کے ملکہ تامہ حاصل نہیں ہوتا۔ زرنوجی بھی سبق کا اعادہ و تکرار، طالب علم کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر سبق آسانی سے ذہن نشین نہیں ہو سکتا۔ ان کی رائے کے مطابق کل کا سبق پانچ مرتبہ، اس سے پہلے کا چار مرتبہ اور اس سے پہلے کا تین مرتبہ اور اس سے پہلے کا دو مرتبہ اور اس سے پہلے کا ایک مرتبہ دہرانا چاہیے۔ سبق کو بد شوقی اور بددلی سے نہ دہرانا چاہیے۔ ابو یوسف کے متعلق ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک دن فقہا میں بیٹھے فقہ کے متعلق نہایت نشاط اور خوشی سے گفتگو کر رہے تھے حالانکہ وہ کئی دن کے بھوکے تھے جس کا علم ان کے داماد کے سوا جوان کے پاس بیٹھے تھے کسی کو نہ تھا۔

تعلیم میں جبر و سختی

طریقہ تعلیم میں سختی اختیار کرنے کے متعلق بھی علماء کی رائیں مختلف ہیں۔ ابو علی سینا اپنی تصنیف "السیاست" میں معلم کے لیے ہاتھ کا استعمال مفید خیال کرتے ہیں لیکن ابن خلدون کا خیال ہے کہ متعلم کیا بلکہ ہر اس شخص پر جس کی تربیت قہر و سختی سے کی جاتی ہے برا اثر ہوتا ہے۔ قہر و سختی طبیعت کو بجھا دیتی ہے۔ طالب علم کاہلی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور سزا سے بچنے کے لیے بات بات میں مکر و فریب سے کام لیتا ہے۔ امام غزالی کا قول ہے کہ طالب علم کو بری باتوں سے کنایہ و محبت کے ساتھ روکا جائے، کھلم کھلا کہہ دینے یا ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہ لینا چاہیے کیونکہ صاف صاف کہہ دینے سے ہیبت و حجاب باقی نہیں رہتا اور مخالفت کی جرأت بڑھ جاتی ہے۔

محمد ابن ابی زید معلم و متعلم کے موضوع پر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ "اگر معلم سزائے جسمانی ضروری سمجھتا ہے تو تین چھڑی سے زیادہ نہ مارے، خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کا قول ہے کہ "جس شخص کی تادیب شرع سے نہیں ہوتی اس کی تادیب سختی سے بھی ناممکن ہے"۔

تادیب و تعلیم کے متعلق ہارون رشید نے جو ہدایات اپنے لڑکے محمد امین کے استاد احمر کو دی تھیں وہ قابل ذکر ہیں۔ ہارون رشید نے محمد امین کو احمر کے سپرد کرتے وقت فرمایا "اے احمر میں اپنے لخت جگر کو تیرے سپرد کرتا ہوں میں اس پر تجھ کو پورا اختیار دیتا ہوں، تیری اطاعت اس پہ فرض ہے، میں نے مشکل کام تیرے سپرد کیا ہے تو میرے اعتبار کے مطابق اس کو پورا کر، امین کو قرآن پڑھا، اخبار و تاریخ سے آگاہ کر اور اشعار عرب یاد کرا، سنن نبوی کی تعلیم دے اور محل کلام بتلا، بے موقع ہنسی سے منع کر، مشائخ بنو ہاشم کی تعظیم کا تخم اس کے دل میں بو، اور اس کو بتا کہ جب قائد لشکر اس کے پاس آئیں تو ان کی پوری تعظیم کرے۔ ہر وقت اس کو کچھ نہ کچھ مفید باتیں بتا، اس کی طبیعت ہرگز ملول نہ کر کہ بطالت و بیکاری کا شکار ہو جائے۔ غرضیکہ جہاں تک ہو سکے نرمی و سہولت سے کام لے اور بری باتوں سے منع کر، اگر کہنے سے مانے تو جھڑ کنے کا تجھے اختیار ہے، اگر جھڑکی کو بھی خیال میں نہ لائے تو بے تامل سزا دے۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہارون رشید کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آتی تھی تو دوران تعلیم میں شہزادوں کو بھی سزادی جاتی تھی۔ مامون کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے استاد یزیدی نے اس کو ایک بار جسمانی سزادی جس کو مامون اپنی بہبودی کا باعث خیال کرتا تھا۔

تعلیم کی عمر

تعلیم کس عمر میں شروع کرنا چاہیے اور تعلیم کے کون سے اوقات مناسب ہیں۔ اس کے متعلق بھی متعدد اقوال ہیں یوں تو تعلیم کا وقت گہوارہ سے شروع ہو کر لحد تک قائم رہتا ہے لیکن مسلمانوں میں چھ برس کی عمر سے عموماً تعلیم شروع کر دی جاتی تھی اور اس عمر میں نماز کی بھی تاکید کیجاتی تھی۔ تعلیم دینے کا بہترین وقت صبح اور مغرب وعشا کے درمیان خیال کیا جاتا تھا۔ ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے کافی عمر گزر جانے کے بعد تعلیم شروع کی، چنانچہ حسن بن زیاد جو ابو حنیفہ کے شاگرد تھے ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسی برس کی عمر میں انہوں نے علم فقہ سیکھنا شروع کیا، چالیس برس تک بستر پر نہیں سوئے اور چالیس برس تک فتویٰ دیتے رہے، ان کی عمر ایک سو ساٹھ برس کی ہوئی۔

زبانی یاد

زبانی یادداشت پر بڑا زور دیا جاتا تھا اور جو لوگ غیر معمولی قوت حافظہ رکھتے تھے، ان کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی اور جو طالب علم قرآن مجید حفظ کرتا تھا اس کی مختلف طریقوں سے ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ بغداد میں اس قسم کے طلبہ کو اونٹ پر سوار کر کے سڑکوں پر نکالتے تھے اور ان پر بادام بکثرت نچھاور کرتے تھے چنانچہ ایک طالب علم کی آنکھ ہی بادام کی ضرب سے جاتی رہی۔ قوت حافظہ پر زور دیئے جانے کا سبب یہ نہ تھا کہ اس زمانے میں کتابوں کی کمی تھی کیونکہ پہلی صدی کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر علماء کی بیویاں متعدد مواقع پر اپنے شوہروں سے محض اس بات پر خفا ہو گئیں کہ وہ اپنی آمدنی کا زیادہ حصہ کتابوں کی فراہمی پر خرچ کر دیتے تھے اور مشہور عالم جاحظ کے متعلق تو مشہور ہی ہے کہ وہ اپنی ضعیف العمری میں کتابوں کے بوجھ سے دب کر مر گیا۔ اس کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ آئندہ جب اسلامی ممالک میں لاتعداد کتب خانے موجود تھے اور کتابوں کا رواج عام ہو گیا تھا اس وقت بھی زبانی یاد کرنے ہی پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اور شعر و شاعری میں تو قابلیت کا انحصار ہی اس بات پر تھا کہ ایک شخص کو اشعار بہ کثرت یاد ہوں۔

حماد، ولید بن عبدالملک اور ہشام کے درباریوں میں سے تھا اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سیکڑوں قصیدے شعرائے جاہلیت کے زبانی سنا سکتا تھا۔ ابوالتوکل الہیثم بن احمد بن ابی غالب روایت اشعار و اخبار میں اندلس کا غیر معمولی شخص کہا جاتا تھا۔ ابن سعید نے بیان کیا ہے کہ وہ ایک بار اس کے ساتھ اشبیلیہ کے ایک امیر کے ہاں گیا اور اس کے حافظہ کے متعلق تذکرہ چھڑا، یہ واقعہ شروع رات کا تھا۔ ابوالتوکل الہیثم نے کہا اگر آپ لوگ چاہیں تو میرا امتحان لے سکتے ہیں۔ حاضرین نے کہا بسم اللہ، اس نے کہا آپ کوئی قافیہ چن لیجیے، لوگوں نے 'ق' کا قافیہ چنا، ابوالہیثم "ارق علی ارق و مثلی بارق" کی بحر میں رات بھر اشعار سناتا رہا یہاں تک کہ سویرا ہو گیا اور بہت سے لوگ سنتے سنتے سو گئے، ایسا ہی دوسرا واقعہ ابوالتوکل الہیثم کا مقری نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ علما کے مجمع میں گیا جہاں وہ چند کتابیں دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب دیوان "ذمی الرحلہ" دیکھ رہے۔ التوکل الہیثم نے دیوان ان کے سامنے سے اٹھالیا ان کو یہ حرکت ناگوار گزری۔ ابوالتوکل نے کہا کہ "آپ لوگ جن کو کہ ایک بیت بھی یاد نہیں، مجھے کہ پورا دیوان زبانی یاد ہے کیوں دیکھنے سے منع کرتے ہیں" لوگوں کو یقین نہ آیا اور اس سے کہا کہ "اگر یاد ہے تو سناؤ۔" اس نے شروع سے سنانا شروع کیا جب نصف تک پہنچا تو لوگ اس کے قائل ہو گئے اسی طرح اور بہت سے لوگ ایسے تھے جن کو فقہ کے تمام مسائل ازبر ہوتے تھے اور ہزاروں حدیثیں مع اسناد کے زبانی سنا سکتے تھے۔ منصور کے زمانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اصمعی اپنے حافظہ کے لیے بہت مشہور شخص ہوا ہے۔

امام مروزی کو ستر ہزار حدیث یاد ہونے کا دعویٰ تھا۔ امام بخاری کے مخالفین نے ان کی قوت حافظہ کی آزمائش کی تو معلوم ہوا کہ سوا حادیث ایک ہی سند سے زبانی یاد تھیں۔ الغزالی کو جو مسلمانوں میں ''حجۃ الاسلام'' کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں، ہزاروں حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ ان کے متعلق ایک مشہور قصہ ہے کہ جب آپ ابو النصر اسماعیلی سے درس ختم کر کے مرجان سے واپس آرہے تھے تو آپ کے قافلہ کو ڈاکوؤں نے راستہ میں لوٹ لیا اور سب سامان کے ساتھ ابو النصر اسماعیلی کے لکھائے ہوئے تعلیقات (نوٹس) بھی چھین لیے۔ آپ نے ڈاکوؤں کے سردار سے درخواست کی کہ وہ ان کو تعلیقات واپس کر دے کیونکہ آپ نے اتنا پر مشقت طویل سفر صرف ابو النصر اسماعیلی کے درس سے مستفید ہونے کے لیے اختیار کیا تھا۔ سردار ہنس پڑا اور کہا کہ ''جب تمہارا یہ حال ہے کہ کاغذ نہ رہا تو کورے رہ گئے تو تم نے کیا خاک سیکھا۔'' اس فقرے کا آپ پر بہت اثر ہوا اور اس کے بعد آپ نے ہمیشہ ہر چیز کو زبانی یاد کرنے کی کوشش کی۔

محدثین کے علاوہ دیگر علماء و شعرا بھی بہت زبردست حافظہ رکھتے تھے۔ متنبی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ عموماً کتابوں کو پڑھ کر زبانی یاد کر لیا کرتا تھا۔ بدیع الزماں ہمدانی اپنے حافظہ کی ہی وجہ سے بدیع الزماں (عجوبہ روزگار) کے لقب سے مشہور ہوا۔ مشہور معتزلی الجبائی کے متعلق مشہور ہے کہ ہزاروں صفحات حافظہ سے املا کرا دیتا تھا اور املا کے دوران میں کبھی کبھی صرف الخوارزمی کی تقویم دیکھ لیتا تھا، بہاء الدین کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ حافظہ بڑھانے کے لیے طلبہ خاص اہتمام کرتے تھے چنانچہ ایک بار مدرسہ نظامیہ کے طلبہ نے حافظہ بڑھانے کے لیے مغز بھلاواں کا استعمال کیا اور ایک لڑکے کا دماغ اس قدر خراب ہو گیا کہ وہ ننگا درسگاہ میں چلا آیا۔ معلوم ہوا کہ حافظہ بڑھانے کے لیے مغز بھلاواں کھایا تھا۔ زمخشری کا قول ہے کہ ''ایک عالم اپنی نوٹ بک اور ایک سوداگر اپنی حساب کی کتاب پر فخر کرتا ہے لیکن ایک عالم کے لیے اس کی قوت حافظہ ہی فخر کی چیز ہے۔''

اعلیٰ تعلیم کا طریقہ

اعلیٰ تعلیم بھی اول اول مساجد ہی میں دی جاتی تھی اور طلبہ حلقہ میں بیٹھ کر استاد سے املا یا درس لیتے تھے۔ استاد مسجد کے ستون سے متصل اونچی جگہ پر بیٹھتا تھا جو مجلس کہلاتی تھی اور اس پر کوئی کپڑا یا دری بچھا دی جاتی تھی جس کو سجادہ کہتے تھے، طلبہ کو حلقوں میں شرکت کی مکمل آزادی تھی جہاں اور جس حلقہ میں چاہیں شریک ہوں۔

ابتدائی صدیوں میں املا بہترین طریقہ تعلیم خیال کیا جاتا تھا اور عموماً دینیات و لسانیات کے علماء اسی طریقہ تعلیم کو اختیار کرتے تھے، حلقوں میں طلبہ کی تعداد مختلف ہوتی تھی اور اس کا اندازہ دواتوں سے جو اُن کے لیے رکھی جاتی تھیں کیا جاتا تھا۔ خطیب بغدادی کے بیان کے مطابق ابو حامد اسفرائنی کے حلقہ کی تعداد سات سو ہوا کرتی تھی، اسی طرح رضی الدین نیشاپوری کے حلقہ میں چار سو طلبہ شریک ہوتے تھے۔ جب حلقہ معمول سے زیادہ وسیع ہو جاتا تو استاد کے سامنے چند اور علماء کھڑے ہو جاتے تھے جو دور کے طلبہ کو استاد کے خاص الفاظ دہرا کر سناتے تھے، یہ لوگ مستملی کہلاتے تھے۔ اس طریق تعلیم سے بہت سے علما نے متعدد کتابیں لکھائیں۔

مشہور معتزلی الجبائی نے الخوارزمی کی تقویم کے علاوہ اور کسی کتاب کو دیکھے بغیر ہزاروں صفحے لکھوا دیئے۔ اسی طرح ابو علی القالی نے ''امالی'' کی پانچ جلدیں زبانی لکھوادیں۔ دسویں صدی میں ماہر لسانیات مطرز نے اپنی مشہور کتاب ''الیاقوت'' اسی طریقہ املا سے لکھوانا شروع کی اور پوری کتاب اسی طرح ختم کرائی، بعد کو اس نے کتاب میں فوائد و ضمیمے شامل کیے جس کو اس کے مشہور شاگرد ابو اسحاق طبری نے پڑھ کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طلبہ کو سنایا، اس کے بعد اس کے ایک مشہور طالب علم ابوالفتح نے اس کو پڑھ کر سنایا اور مطرز نے اس میں مزید اضافہ کیا اور یہ کتاب مکمل ہوئی۔

مشہور مفسر محمد ابن احمد سرخسی (متوفی ۴۸۳ھ ۔ ۱۰۹۰ء) کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ ایک بار اپنی آزادیٔ رائے کی وجہ سے ایک عمیق غار میں مقید کر دیے گئے تو ان کے تلامذہ اس غار کے کنارے بیٹھ کر ان سے استفادہ کرتے تھے اور وہ ان کو بغیر کسی کتاب کی مدد کے نوٹ لکھوا دیتے تھے، چنانچہ المبسوط کی متعدد جلدیں اسی طرح لکھوائی گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ ابوالقاسم الزجاجی (۳۳۹ھ ۔ ۹۵۰ء) دسویں صدی کا آخری شخص تھا جس نے لسانیات پر املا لکھوایا۔

دسویں صدی کے آخر میں یہ طریقہ تعلیم بدلا اور بالخصوص علمائے لسانیات نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا جس کو "تدریس" کہتے ہیں اس کی یہ صورت تھی کہ طلبہ سے سبق پڑھوا کر تنقید و تشریح کی جاتی تھی اور استاد جو مطالب علمیہ بیان کرتے تھے ان کو طلبہ احتیاط کے ساتھ قلمبند کرتے تھے اس طرح کی یادداشتیں تعلیقات کہلاتی تھیں۔ تدریس کے اس طریقہ تعلیم کے ساتھ ساتھ مناظرہ بھی شروع ہو گیا لیکن اس قسم کے مناظرے مساجد میں نامناسب خیال کیے جاتے تھے اور مسجدوں سے علیحدہ مدارس کے قیام کا ایک سبب یہ بھی ہوا۔

دینیات کے اساتذہ حمد و درود کے بعد خوش لحن متعلم سے قرآن پڑھوا کر درس شروع کرتے تھے اس کے بعد اپنے طلبہ اور شہر کے باشندوں کے لیے دعائے خیر مانگتے تھے۔ اس کے بعد مشکل مسائل کی توضیح کر کے اس کے متعلق طلبہ سے سوال کرتے، طلبہ کو بھی درمیان درس میں سوال کرنے کا اختیار تھا، اس سلسلہ میں لسانیات کے ایک عالم ابو عبیدہ نامی کا واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، اس سے کسی طالب علم نے ایک احمقانہ سوال کیا کہ یہ "یہ کیسے ہوا؟" اسی طرح دوسرے طالب نے اور پھر تیسرے طالب علم نے لغو سوالات کیے، یہ ہنگامہ دیکھ کر ابو عبیدہ ہاتھ میں جوتے لے کر یہ کہتا ہوا بھاگا کہ "آج اتنے جانوروں کو یہاں کس نے جمع کر دیا ہے۔"

درس حدیث میں تقدس کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا، برقانی (۴۴۲ھ ۔ ۱۰۵۰ء) کا بیان ہے کہ اس کا استاد، حدیث کا درس دینا احتیاط اور تقدس واحترام کی رعایت نہ رکھنے کے خوف سے نہیں دیتا تھا۔ اس کے شاگرد ان احادیث کو چپکے سے لکھ لیتے تھے جن کو وہ دوران درس میں ضمناً بیان کرتا تھا، ایک عالم کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے ستر برس سے پہلے حدیث پر درس دینا قبول نہیں کیا۔

نوری کے قول کے مطابق یہ امر ضروری تھا کہ محدث نہا دھو کر، عطر لگا کر، داڑھی میں کنگھا کر کے درس حدیث شروع کرے اور دوران درس میں وقار کے ساتھ سیدھا بیٹھا رہے۔

ابن الجوزی کا بیان ہے کہ ایک عالم دوران درس میں ہاتھ پاؤں یا جسم کے کسی حصہ کو جنبش نہیں دے سکتا تھا یہاں تک کہ اس کا تمام بدن شل ہو جاتا تھا۔

دسویں صدی میں صاحب ابن عباد کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ حدیث کی املا کا قصد کرتے تھے تو نہانے دھونے کے بعد کپڑے پہن کر آتے اور حاضرین سے یوں مخاطب ہوتے تھے، "آپ لوگ جانتے ہیں مجھے دینیات سے کتنا شغف ہے۔" حاضرین سے اس بیان کی تائید کے بعد وہ کہتے کہ "میں ہمیشہ اس موضوع کے مطالعہ میں مشغول رہا ہوں اور جو کچھ میں نے اس کے حاصل کرنے میں خرچ کیا ہے وہ میرے باپ دادا کے جیب سے خرچ ہوا، مجھ میں اب بھی بہت سی خامیاں موجود ہیں جس کی میں آپ کے سامنے خدا سے توبہ کرتا ہوں۔"

صاحب ابن عباد نے ایک مکان تعمیر کرایا تھا جس کا نام "دارالتوبہ" رکھا تھا۔ وہ حدیث پر درس دینے سے پہلے اس مکان میں قیام کر کے توبہ کرتا تھا اور اس کا لحاظ رکھتا تھا کہ فقہا کے اصول کے مطابق توبہ کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دار خطنی (۳۸۵ھ۔۹۹۵ء) طلبہ کے حدیث پڑھتے وقت چپکے چپکے دعا مانگا کرتا تھا اور غلطیوں کی طرف ''سبحان اللہ'' کہہ کر طلبہ کو متوجہ کرتا تھا، باہلی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ درس میں اس قدر مشغول ہو جاتا تھا کہ اس کو کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ کتنا وقت گزر گیا۔ دینیات کا درس عموماً لفظ ''قوموا'' پر ختم ہوتا تھا۔ یعنی اب اُٹھ کھڑے ہو، درس ختم ہو گیا۔

تعلیم دینے کے شرائط

اسلام میں تعلیم کی مکمل آزادی تھی اور ہر قابل شخص درس دے سکتا تھا بشرطیکہ اس کو اپنے علم پر پورا بھروسہ ہو اور وہ اس کا اہل ہو۔ اہلیت درس کے متعلق گیارہویں صدی عیسوی یعنی مدرسوں کے قیام سے پہلے دینیات کی تعلیم کے متعلق کسی قدیم عالم کا سلسلہ ضروری خیال کیا جاتا تھا لیکن جو مضامین، دینیات سے تعلق نہ رکھتے تھے ان کی تعلیم دینے کے لیے سلسلہ کی ضرورت نہ تھی، چنانچہ ابو علی سینا نے جنھوں نے خود علم طب حاصل کیا تھا۔ سولہ برس کی عمر سے طب پر تعلیم دینی شروع کر دی تھی، البتہ اس کی ممانعت ضروری تھی کہ عام درس میں بغیر مصنف کی اجازت کے اس کی کتاب نہ استعمال کی جائے، اگر مصنف فوت ہو جاتا تو اس کے ورثہ سے اجازت طلب کی جاتی تھی، چنانچہ تیرھویں صدی عیسوی میں صحیح بخاری کی تعلیم کے لیے جو تین سو برس پہلے لکھی گئی تھی بخاری کے ورثہ سے اجازت لی جاتی تھی، مصنف کی اولاد کو بھی بعض اوقات اجازت دینے کا اختیار نہیں ہوتا تھا کیونکہ بعض مصنف شاگردوں کو اپنی اولاد پر ترجیح دیتے تھے۔ جو قاعدہ تصنیفات کے متعلق تھا، وہی درس کے متعلق تھا یعنی کسی عالم کے درس سے بھی اس کی اجازت کے بغیر کام نہیں لیتے تھے، اس سے دو فائدے ملحوظ خاطر تھے ایک تو مصنف کے حقوق کو برقرار رکھنا، دوسرے درس کو مستند ثابت کرنا۔

زمخشری کے علاوہ تمام علما اجازت دینے میں فیاض تھے اور بہت سے علما اپنے درسوں کو قلم بند کر دیتے تھے تاکہ طلبہ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ انتخاب درس اور تعین اوقات میں علما کو ہمیشہ آزادی حاصل تھی، یہاں تک کہ مدرسوں کے بانیوں اور ان کے خاندان کے لوگوں کو اساتذہ کی تقرری و معزولی کا تو اختیار حاصل تھا لیکن طریقہ تعلیم و انتخاب مضامین میں اساتذہ بالکل آزاد تھے اور انھیں اختیار تھا خواہ اپنی تصنیف کا درس دیں یا کسی اور کی تصنیف کا، تعطیلات کا کوئی خاص وقت اور قاعدہ نہ تھا اور نہ درس کے درمیان خاص وقفہ کا تعین تھا۔ چنانچہ البروی دن میں ایک سے زیادہ درس دیا کرتے تھے لیکن جب مساجد یا مساجد سے ملحق عمارتوں میں درس دیئے جاتے تھے تو نماز کے وقت درس بند کر دیئے جاتے تھے۔ درس کا دور پورا ہو جانے کے بعد جب اساتذہ مناسب خیال کرتے تھے تو تعطیل دیتے تھے۔

درس نہایت آہستہ اور رُک رُک کر دیا جاتا تھا تاکہ طلبہ نوٹ لکھ سکیں، اگر وہ نوٹ نہیں لکھتے تھے تو ان سے باز پرس کی جاتی تھی لیکن بعض طلبہ ایسے ذہین اور قوی حافظہ کے ہوتے تھے کہ وہ پورا درس زبانی یاد کر لیتے تھے۔ ان سے اس قسم کی باز پرس نہیں کی جاتی تھی چنانچہ اسفرائنی قشیری جو اپنی یادداشت کے لیے مشہور تھا اس قسم کی باز پرس سے بری رہتا تھا، بعض اساتذہ صرف درس دینے ہی پر قناعت نہ کرتے تھے بلکہ یہ دیکھنے کے لیے آیا طلبہ درس کو سمجھتے ہیں یا نہیں، طلبہ سے سوالات بھی کرتے تھے، چنانچہ اسلام کے قدیم ترین استاد الزہری جن کا نظریہ تھا کہ باہم مباحثہ و تبادلہ خیالات سے طلبہ کو بہت کچھ فائدہ پہنچتا ہے اپنے طلبہ سے سوال و جواب کے اس حد تک عادی تھے کہ مسجد سے باہر یا طلبہ کے گھر پر بھی گفتگو کر بیٹھتے تھے۔ بعض اساتذہ اعلیٰ تعلیم کے حلقوں کے علاوہ چھوٹے درجے کے طلبہ کو بھی درس دیتے تھے اور مسافر طلبہ کے شبہات بھی دور کرتے تھے چنانچہ زناد جب مدینہ کی مسجد سے نکلتے تھے تو طلبہ ان کو گھیر لیتے تھے، کوئی ان سے دینیات کے متعلق سوال کرتا، کوئی ریاضی کا مسئلہ دریافت کرتا، کوئی ان سے کسی شعر کا مطلب پوچھتا اور کوئی حدیث کے متعلق استفسار کرتا، ابو زناد سب کو جواب دیتے ہوئے ان کے ساتھ جلوس میں چلتے رہتے تھے۔ (جاری ہے)

© rasailojaraid.com